

تفہیم القرآن

الروم

(۱۳)

۱۲؎ پس (اُسے نبی، اور نبی کے پیروں) ایک سُو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں
جمادو، قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بتائی ہوئی

۱۲؎ یہ پس اس معنی میں ہے کہ جب حقیقت تم پر کھل چکی، اور تم کو معلوم ہو گیا کہ اس کائنات کا اور
خود انسان کا خالق و مالک اور حاکم ذی اختیار ایک اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے تو اس کے بعد
تمہارا طرز عمل یہ ہونا چاہیے۔

۱۳؎ اس دین سے مراد وہ خاص دین ہے جسے قرآن پیش کر رہا ہے، جس میں بندگی، عبادت
اور طاعت کا مستحق اللہ وحدہ لا شریک کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جس میں اُتو بہتیت اور اس کی صفات
و اختیارات اور اس کے حقوق میں قطعاً کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ٹھیرایا جاتا جس میں
انسان اپنی رضا و رغبت سے اس بات کی پابندی اختیار کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کی بندت
اور اس کے قانون کی پیروی میں بسر کرے گا۔

۱۴؎ ایک سُو ہو کر اپنا رخ اس طرف جمادو، یعنی پھر کسی اور طرف کا رخ نہ کرو۔ زندگی کے
لیے اس راہ کو اختیار کر لینے کے بعد پھر کسی دوسرے راستے کی طرف التفات تک نہ ہونے پائے۔
پھر تمہاری فکر اور سوچ ہو تو مسلمان کی سی اور تمہاری پسند اور ناپسند ہو تو مسلمان کی سی۔ تمہاری تقدیر
اور تمہارے معیار ہوں تو وہ جو اسلام تمہیں دیتا ہے، تمہارے اخلاق اور تمہاری سیرت و کردار کا پتہ
ہو تو اس طرح کا جو اسلام چاہتا ہے، اور تمہاری انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات چلیں تو
اُس طریقے پر جو اسلام نے تمہیں بتایا ہے۔

ساخت جلدی نہیں جاسکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے
 ۵۵ یعنی تمام انسان اس فطرت پر پدا کئے گئے ہیں کہ ان کا کوئی خالق اور کوئی رب اور کوئی معبود
 مطابقتی ایک اللہ کے سوا نہیں ہے۔ اسی فطرت پر تم کو قائم ہو جانا چاہیے۔ اگر خود مختاری کا
 رویہ اختیار کرو گے تب بھی فطرت کے خلاف چلو گے اور اگر نیکو خیر کا طوق اپنے گلے میں ڈالو گے
 تب بھی اپنی فطرت کے خلاف کام کرو گے۔

اس مضمون کو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے
 کہ حضور نے فرمایا ما من مولود یولد الا علی الفطرة فابواه یهودانہ او نصرانہ او مجسانہ
 کہا نتیجہ البہیمۃ بہیمۃ جمعاً، ہل تخسرون فیہا من جند عاء یعنی بزرگچہ جو کسی ماں کے
 پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اصل انسانی فطرت پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو اسے بعد میں عیسائی
 یا یہودی یا مجوسی وغیرہ بنا ڈالتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہر میانور کے پیٹ سے پورا کا پورا
 صحیح و سالم جانور برآمد ہوتا ہے، کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لیکر نہیں آتا، بعد میں مشرکوں نے اپنے
 اوبابم جاہلیت کی بنا پر اس کے کان کاٹتے ہیں۔

مسند احمد اور نسائی میں ایک اور حدیث ہے کہ ایک جنگ میں مسلمانوں نے دشمنوں کے بچوں
 تک کو قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا ما بال اقوام جاؤ
 القتل الیوم حتی قتلوا الذریۃ، لوگوں کو کیا ہو گیا کہ آج وہ حد سے گزر گئے اور بچوں تک کو
 قتل کر ڈالا۔ ایک شخص نے عرض کیا کیا یہ مشرکوں کے بچے نہ تھے؟ فرمایا: ہاں! اختیار کرا بناؤ المشرکین،
 وہ تمہارے بہترین لوگ مشرکین ہی کی تو اولاد ہیں؟ پھر فرمایا کل نسمة تولد علی الفطرة حتی
 یعب عنہ لسانہا فابواہا یهودانہا او نصرانہا، ہر متنفس فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یہاں
 تک کہ جب اس کی زبان کھلنے پر آتی ہے تو ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا لیتے ہیں۔

ایک اور حدیث جو امام احمد نے عیاض بن حمار النجاشی سے نقل کی ہے اس میں بیان ہوا
 ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ کے دوران میں فرمایا ان ربی یقول انی خلقت

اور نماز قائم کر لو، اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے
۴۹ یعنی تمہارے دل میں اس بات کا خوف ہونا چاہیے کہ اگر اللہ کے پیدائشی بندے ہونے کے
باوجود تم نے اس کے مقابلے میں خود مختاری کا رویہ اختیار کیا، یا اس کے بجائے کسی اور کی بندگی کی تو اس
نک سحابی ویلے وفائی کی سخت سزا تمہیں بھگتنی ہوگی۔ اس لیے تمہیں ایسی ہر روش سے بچنا چاہیے جو تم کو
خدا کے غضب کا مستحق بناتی ہو۔

۵۰ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے غضب کا خوف، دونوں قلب کے افعال ہیں اس قلبی
کیفیت کو اپنے ظہور اور اپنے استحکام کے لیے لازماً کسی ایسے جسمانی فعل کی ضرورت ہے جس سے خارج
میں بھی ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص واقعی اللہ وحدہ لا شریک کی بندگی کی طرف پلٹ آیا ہے
اور آدمی کے اپنے نفس میں بھی اس رجوع و تقویٰ کی کیفیت کو ایک عملی ممارست کے ذریعہ سے
پے در پے نشوونما نصیب ہوتا چلا جاتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اس ذہنی تبدیلی کا حکم دینے کے بعد
فوراً ہی اس جسمانی عمل یعنی اقامتِ صلوة کا حکم دیتا ہے۔ آدمی کے ذہن میں جب تک کوئی خیالی محسوس خیال کی
حد تک رہتا ہے اس میں استحکام اور پائیداری نہیں ہوتی۔ اس خیال کے ماند پڑ جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے
اور بدل جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کے مطابق کام کرنے لگتا ہے تو وہ خیال اس
کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے، اور جوں جوں وہ اس پر عمل کرتا جاتا ہے، اس کا استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں
تک کہ اس عقیدہ و فکر کا بدل جانا یا ماند پڑ جانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا
جاتے تو رجوع الی اللہ اور خوفِ خدا کو مستحکم کرنے کے لیے ہر روز پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ادا
کرنے سے بڑھ کر کوئی عمل کارگر نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرا جو عمل بھی ہو، اس کی قربت و یرودیر میں آتی ہے
یا متفرق صورتوں میں مختلف مواقع پر آتی ہے۔ لیکن نماز ایک ایسا عمل ہے جو ہر چند گھنٹوں کے بعد
ایک ہی متعین صورت میں آدمی کو دائماً کرنا ہوتا ہے، اور اس میں ایمان و اسلام کا وہ پورا سبق، جو
قرآن نے اسے پڑھایا ہے، آدمی کو بار بار دہرانا ہوتا ہے تاکہ وہ اسے بھولنے نہ پائے۔ فرید
دیوان کفار اور اہل ایمان، دونوں پر یہ ظاہر ہونا ضروری ہے کہ انسانی آبادی میں سے کس کس نے نجات

اور گردہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گردہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔
لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع
کر کے اُسے پکارتے ہیں، پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو
کی روش چھوڑ کر اطاعتِ رب کی روش اختیار کر لی ہے۔ اہل ایمان پر اس کا ظہور اس لیے درکار ہے کہ
ان کی ایک بدعت اور سوسائٹی بن سکے اور وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں اور
ایمان و اسلام سے جب بھی ان کے گردہ کے کسی شخص کا تعلق ڈھیلا پڑنا شروع ہو اسی وقت کوئی کھلی
علامت فوراً ہی تمام اہل ایمان کو اس کی حالت سے باخبر کر دے۔ کفار پر اس کا ظہور اس لیے ضروری
ہے کہ ان کے اندر کی سوئی ہوئی فطرت اپنے ہم جنس انسانوں کو خداوندِ حقیقی کی طرف بلا رہتے دیکھ کر
جاگ سکے، اور جب تک وہ نہ جاگے ان پر خدا کے فرمانبرداروں کی عملی سرگرمی دیکھ دیکھ کر دہشت
طاری ہوتی رہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی سب سے زیادہ موزوں ذریعہ ہے
اس مقام پر یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا یہ حکم مکہ معظمہ کے اُس دور
میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں کی ایک مٹھی بھر جماعت کفارِ قریش کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی تھی اور اس کے
بعد بھی ۹ برس تک پستی رہی۔ اس وقت دُور دور بھی کہیں اسلامی حکومت کا نام و نشان نہیں تھا۔ گناہ
اسلامی حکومت کے بغیر بے معنی ہوتی۔ جیسا کہ بعض نادار سمجھتے ہیں، یا اقامتِ صلوٰۃ سے مراد اقامتِ
کونسا ہے سے ہوتا ہی نہیں بلکہ ”نظامِ ربوبیت“ چلانا ہوتا، جیسا کہ منکرینِ سنت کا دعویٰ ہے۔ تو
اس حالت میں قرآن مجید کا یہ حکم دنیا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ اور یہ حکم آنے کے بعد ۹ سال تک نبی صلی اللہ
علیہ وسلم اور مسلمان اس حکم کی تعمیل آخر کس طرح کرتے رہے؟
اے یہ اشارہ ہے اس چیز کی طرف کہ نوعِ انسانی کا اصل دین وہی دینِ فطرت ہے جس کا اُپر
ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دین مشرکاً نہ مذاسب سے بتدریج ارتقا کرتا ہوا توحید تک نہیں پہنچا ہے، جیسا کہ
قیاس و گمان سے ایک فلسفہ مذہب گھڑ لینے والے حضرات سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ جتنے
مذہب و دنیا میں پائے جاتے ہیں یہ سب کے سب اُس اصلی دین میں بگاڑ آنے سے رونما ہوئے ہیں اور

یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ ہمارے کیسے ہوتے احسان کی ناشکری کریں۔ اچھا، مزے کر لو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں؟

جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں، اور جب ان کے اپنے کیسے کر تو توں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس

یہ بگاڑ اس لیے آیا ہے کہ مختلف لوگوں فطری حقائق پر اپنی اپنی نو ایجاد باتوں کا اضافہ کر کے اپنے الگ دین بنا ڈالے اور ہر ایک اصل حقیقت کے بجائے اس اضافہ شدہ چیز کا گرویدہ ہو گیا جس کی بدولت وہ دوسروں سے جدا ہو کر ایک مستقل فرقہ بنا تھا۔ اب جو شخص بھی ہدایت پاسکتا ہے وہ اسی طرح پاسکتا ہے کہ اس اصل حقیقت کی طرف پلٹ جائے جو دین حق کی بنیاد تھی، اور بعد کے ان تمام اضافوں سے اور ان کے گرویدہ ہونے والے گروہوں سے دامن جھاڑ کر بالکل الگ ہو جائے۔ ان کے ساتھ رابطہ کا جو رشتہ بھی وہ لگاٹے رکھے گا وہی دین میں خلل کا موجب ہوگا۔

۲۵۲ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں تو حید کی شہادت موجود ہے، امیدوں کے سہارے جب بھی ٹوٹتے لگتے ہیں، ان کا دل خود ہی اندر سے پکارتے لگتا ہے کہ اصل فرمانروائی کائنات کے مالک ہی کی ہے اور اسی کی مدد ان کی بگڑی بنا سکتی ہے۔

۲۵۳ یعنی پھر دوسرے معبودوں کی ندریں اور نیازیں چڑھنی شروع ہو جاتی ہیں اور کہا جانے لگتا ہے کہ یہ مصیبت فلاں حضرت کے طفیل اور فلاں آستانے کے صدقے میں ٹلی ہے۔

۲۵۴ یعنی آخر کس دلیل سے ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ بلائیں خدا نہیں ٹالتا بلکہ حضرت ٹالتا کرتے ہیں؟ کیا عقل اس کی شہادت دیتی ہے؟ یا کوئی کتاب الہی ایسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ میں اپنے خدائی کے اختیارات فلاں فلاں حضروں کو سے چکا ہوں اور اب وہ

ہونے لگتے ہیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کا چاہتا ہے)۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر

تم لوگوں کے کام بنایا کریں گے؟

۵۵ اور پر کی آیت میں انسان کی جہالت و حماقت اور اس کی ناشکری و تک حرامی پر گرفت تھی اس آیت میں اس کے پھچھور پن اور کم ظرفی پر گرفت کی گئی ہے۔ اس ٹھنڈے کو جب دنیا میں کچھ دولت، طاقت، عزت نصیب ہو جاتی ہے۔ اور یہ دیکھتا ہے کہ اس کا کام خوب چل رہا ہے تو اسے یاد نہیں رہتا کہ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میرے ہی کچھ مہر غاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو مجھے وہ کچھ بیتر بہوا جس سے دوسرے محروم ہیں۔ اس غلط فہمی میں نخر و غرور کا نشہ اس پر ایسا چڑھتا ہے کہ پھر یہ نہ خدا کو خاطر میں لاتا ہے نہ خلق کو۔ لیکن جو نہی کہ اقبال نے منہ موڑا اس کی بہت جواب دے جاتی ہے اور بد نصیبی کی ایک ہی چوٹ اس پر دل نشکستگی کی وہ کیفیت طاری کر دیتی ہے جس میں بہر ذلیل سے ذلیل حرکت کر گزرتا ہے، حتیٰ کہ خود کشی تک کر جاتا ہے۔

۵۶ یعنی اہل ایمان اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ کفر و شرک کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر پڑتا ہے، اور اس کے برعکس ایمان باللہ کے اخلاقی نتائج کیا ہیں۔ جو شخص سچے دل سے خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اسی کو رزق کے خزانوں کا مالک سمجھتا ہے، وہ کبھی اس کم ظرفی میں مبتلا نہیں ہو سکتا جس میں خدا کو بھولے ہوئے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ اُسے کشادہ رزق ملے تو بھولے گا نہیں، شکر کرے گا، خلق خدا کے ساتھ تواضع اور فیاضی سے پیش کرے گا اور خدا کا مال خدا کی راہ میں صرف کرنے سے ہرگز دریغ نہ کرے گا، تنگی کے ساتھ رزق ملے، یا ناقہ ہی پڑ جائیں، تب بھی سبر سے کام لے گا، دیانت و امانت اور خود داری کو ہاتھ سے نہ دے گا، اور آخر وقت تک خدا سے فضل و کرم کی آس لگاٹے رہے گا۔ یہ اخلاقی تبدیلی نہ کسی دوسرے کو نصیب ہو سکتی ہے نہ مشرک کو۔

کہ اس کا حق ہے۔ یہ طریقہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں۔
 ۱۰۔ یہ نہیں فرمایا کہ رشتہ دار، مسکین اور مسافر کو خیرات دے۔ ارشاد یہ ہے کہ یہ اس کا
 حق ہے جو تجھے دینا چاہیے، اور حق ہی سمجھ کر تو اسے دے۔ اس کو دیتے ہو تو اسے یہ خیال نہ
 دل میں نہ آنے پاتے کہ یہ کوئی احسان ہے جو تو اس پر کر رہا ہے، اور تو کوئی بڑی ہستی ہے ان
 کرنے والی، اور وہ کوئی خیر مخلوق ہے تیرا دیا کھانے والی۔ بلکہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہے
 کہ مال کے مالک حقیقی نے اگر تجھے زیادہ دیا ہے اور دوسرے بندوں کو کم عطا فرمایا ہے تو یہ زیادہ
 مال اُن دوسروں کا حق ہے جو تیری آزمائش کے لیے تیرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے تاکہ تیرا
 مالک دیکھے کہ تو ان کا حق پہچانتا اور ان کو پہچانتا ہے یا نہیں۔

اس ارشاد الہی اور اس کی اصلی روح پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ باعسوس کیے بغیر نہیں
 رہ سکتا کہ قرآن مجید انسان کے لیے اخلاقی و روحانی ارتقاء کا جو راستہ تجویز کرتا ہے اس کے لیے
 ایک آزاد معاشرہ اور آزاد معیشت (FREE ECONOMY) کی موجودگی ناگزیر ہے۔ یہ
 ارتقاء کسی ایسے اجتماعی ماحول میں ممکن نہیں ہے جہاں لوگوں کے حقوق ملکیت ساقط کر دیئے جائیں
 ریاست تمام ذرائع کی مالک ہو جائے اور افراد کے درمیان تقسیم رزق کا اپنا کاروبار حکومت کی
 مشینری سنبھال لے، حتیٰ کہ نہ کوئی فرد اپنے اوپر کسی کا کوئی حق پہچان کر سکے، اور نہ کوئی دوسرا
 فرد کسی سے کچھ لے کر اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ خیر سگالی پرورش کر سکے۔ اس طرح کا
 خالص کیونسٹ نظام تمدن و معیشت جسے آج کل ہمارے ملک میں نظامِ اجوبیت کے پروفیرینام
 سے زبردستی قرآن کے سرمنڈھا جا رہا ہے، قرآن کی اپنی اسکیم کے بالکل مخالف ہے، کیونکہ اس میں
 انفرادی اخلاق کے نشوونما اور انفرادی سیرتوں کی تشکیل و ترقی کا دروازہ قطباً بند ہو جاتا ہے قرآن
 کی اسکیم تو اسی جگہ چل سکتی ہے جہاں افراد کچھ وسائل دولت کے مالک ہوں، ان پر آنا مانہ تصرف
 کے اختیارات رکھتے ہوں، اور پھر اپنی رضا و رغبت سے خدا اور اس کے بندوں کے حقوق اخلاص
 کے ساتھ ادا کریں۔ اسی قسم کے معاشرے میں یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ فرداً فرداً لوگوں میں ایک

اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے

طرف ہمدردی، رحم و شفقت، ایثار و قربانی اور حق شناسی و ادائے حقوق کے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوں اور دوسری طرف جن لوگوں کے ساتھ بھلائی کی جائے ان کے دلوں میں بھلائی کرنے والوں کے لیے خیر خرابی احسانندی، امد جزاء الاحسان بالاحسان کے پاکیزہ جذبات نشوونما پائیں، یہاں تک کہ وہ مثالی حالت پیدا ہو جائے جس میں بدی کار کنا اور نیکی کا فروغ یا ناکسی قوتِ جاہرہ کی مداخلت پر موقوف نہ ہو بلکہ لوگوں کی اپنی پاکیزگی نفس اور ان کے اپنے نیک ارادے اس ذمہ داری کو سنبھال لیں۔

۵۵ یہ مطلب نہیں ہے کہ فلاح صرف مسکین اور مسافر اور رشتہ دار کا حق ادا کر دینے سے حاصل ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز حصولِ فلاح کے لیے درکار نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ ان حقوق کو نہیں پہچانتے اور نہیں ادا کرتے وہ فلاح پانے والے نہیں ہیں، بلکہ فلاح پانے والے وہ ہیں جو خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے یہ حقوق پہچانتے اور ادا کرتے ہیں۔

۵۶ قرآن مجید میں یہ پہلی آیت ہے جو سود کی مذمت میں نازل ہوئی۔ اس میں صرف اتنی بات فرمائی گئی ہے کہ تم لوگ تو سود یہ سمجھتے ہوئے دیتے ہو کہ جس کو ہم یہ زائد مال دے رہے ہیں اس کی دولت بڑھے گی۔ لیکن درحقیقت اللہ کے نزدیک سود سے دولت کی افزائش نہیں ہوتی بلکہ زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ آگے چل کر جب مدینہ طیبہ میں سود کی حرمت کا حکم نازل کیا گیا، تو اس پر مزید یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ یحییٰ اللہ الربو ویدری الصدقت؟ اللہ سود کا منہ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے دو اقوال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں ربو سے مراد وہ سود نہیں ہے جو شرعاً حرام کیا گیا ہے، بلکہ وہ عطیہ یا ہدیہ و تحفہ ہے جو اس نیت سے دیا جائے کہ لینے والا بعد میں اس سے زیادہ واپس کر لے گا۔ یا معطلی کے لیے کوئی مفید خدمت انجام دے گا، یا اس کا خوشحال ہو جانا معطلی کی اپنی ذات کے لیے نافع ہو گا۔ یہ ابن عباس، مجاہد، مناک، قتادہ، عکرمہ، محمد بن

ارادے سے دیتے ہو، اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔

انقرظی اور شعبی کا قول ہے۔ اور غالباً یہ تفسیر ان حضرات نے اس بنا پر فرمائی ہے کہ آیت میں اس فعل کا نتیجہ صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں اس دولت کو کوئی افزائش نصیب نہ ہوگی، حالانکہ اگر حاملہ اس سود کا ہوتا جسے شریعت نے حرام کیا ہے، تو مثبت طور پر فرمایا جاتا کہ اللہ کے ہاں اس پر سخت عذاب دیا جائے گا۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں! اس سے مراد وہی معروف ربوہ ہے جسے شریعت نے حرام کیا ہے۔ یہ رائے حضرت حسن بصری اور سدی کی ہے اور علامہ آلوسی کا خیال ہے کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں ربوہ کا لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی تاویل کو مغربیوں نے بھی اختیار کیا ہے۔

ہمارے خیال میں بھی یہی دوسری تفسیر صحیح ہے، اس لیے کہ معروف معنی کو چھوڑنے کے لیے وہ دلیل کافی نہیں ہے جو اوپر تفسیر اول کے حق میں بیان ہوئی ہے۔ سورہ روم کا نزول جس زمانے میں ہوا ہے اس وقت قرآن مجید میں سود کی حرمت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ یہ اعلان اس کے کسی برس بعد ہوا ہے۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو بعد میں کسی وقت حرام کرنا ہوتا ہے، اس کے لیے پہلے وہ ذمہوں کو تیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ شراب کے معاملے میں بھی پہلے عرف اتنی بات فرمائی گئی تھی کہ

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ، قُلْ فِيهِمَا إِتْرَٰكِبٌ وَفَنَاحٌ لِلنَّاسِ وَإِنَّهُمَا آكْبَرُ مِنْ نَعْيِمَآ۔ پھر

محض نماز کے وقت اس سے منع کیا گیا۔ اس کے بعد اس کی قطعی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ اسی طرح یہاں سود کے متعلق صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں ہے جس سے دولت کی افزائش ہوتی ہو بلکہ حقیقی افزائش زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سود در سود کو منع کیا گیا (آل عمران، رکوع ۱۴) اور سب سے آخر میں بجائے خود سود ہی کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔

۱۴۔ اس بڑھوتری کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ یعنی خالص نیت اور جتنے گہرے جذبہ اقبال اور جس قدر شدید طلبِ رضائے الہی کے ساتھ کوئی شخص راہِ خدا میں مال صرف کرے گا اسی قدر اللہ تعالیٰ

اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیا، پھر تمہیں موت دیتا ہے، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ٹھیرائے ہوئے شرکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟ پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں، غشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں۔ (اے نبی) ان سے کہو کہ زمین میں

اس کا زیادہ سے زیادہ اجر دیا گیا۔ چنانچہ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص راہِ خدا میں ایک کھجور بھی دے تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر آحد پہاڑ کے برابر کر دیتا ہے۔

لہٰذا یہاں سے پھر کفار و مشرکین کو سمجھانے کے لیے سلسلہ کلام توجید و آخرت کے مضمون کی طرف پھر جاتا ہے۔

۶۱ یعنی زمین میں تمہارے رزق کے لیے جملہ وسائل فراہم کیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ رزق کی گردش سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ حصہ پہنچ جاتے۔

۶۲ یعنی اگر تمہارے بنائے ہوئے معبودوں میں سے کوئی بھی نہ پیدا کرنے والا ہے، نہ رزق دینے والا، نہ موت و زلیت اس کے قبضہ قدرت میں ہے، اور نہ مرجانے کے بعد وہ کسی کو زندہ کر دینے پر قادر ہے، تو آخر یہ لوگ ہیں کس مرض کی دوا کہ تم نے انہیں معبود بنا لیا؟

۶۳ یہ پھر اس جنگ کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت روم و ایران کے درمیان برپا تھی، جس کی آگ نے پورے شرقِ اوسط کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے مراد وہ فسق و فجور اور ظلم و جور ہے جو شرک یا بہریت کا عقیدہ اختیار کرنے اور آخرت کو نظر انداز کر دینے سے لازماً انسانی اخلاق و کردار میں رونما ہوتا ہے۔ شاید کہ وہ باز آئیں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا سے پہلے اس دنیا میں انسانوں کو ان کے تمام اعمال کا نہیں بلکہ بعض اعمال کا برا نتیجہ اس لیے دکھاتا ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھیں اور اپنے تخیلات کی غلطی کو محسوس کر کے اس عقیدہ صالحہ کی طرف رجوع کریں جو انبیاء و علیہم السلام ہمیشہ سے انسان کے سامنے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں جس کو

چل پھر کر دیکھو پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے، ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔ پس (اے نبی)، اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ جہاد و اس دینِ راست کی سمت میں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن لوگ بھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے۔ اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے وہ اپنے ہی لیے فلاح کا راستہ صاف کر رہے ہیں تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے۔ یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوا میں بھجتا ہے بشارت دینے کے لیے اور تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے اور اس غرض کے لیے کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔ اور ہم نے تم سے

اختیار کرنے کے سوا انسانی اعمال کو صحیح بنیاد پر قائم کرنے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔

۱۵ یعنی روم و ایران کی تباہ کن جنگ آج کوئی نیا حادثہ نہیں ہے۔ پچھلی تاریخ بڑی بڑی قوموں کی تباہی و بربادی کے بیکارڈ سے چھری ہوئی ہے۔ اور ان سب قوموں کو جن خرابیوں نے برباد کیا اور انہیں برباد کر دیا جس سے باز آنے کے لیے کسی قوم سے کہا جا رہا ہے۔

۱۶ یعنی جس کو نہ اللہ تعالیٰ خود مانے گا اور نہ اس نے کسی کے لیے ایسی کسی تدبیر کی کوئی گنجائش چھوڑی ہے کہ وہ اسے ٹال سکے۔

۱۷ یہ ایک جامع فقرہ ہے جو تمام ان مفسرتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے جو کافر کو اپنے کفر کی بدولت پہنچ سکتی ہیں۔ مفسرتوں کی کوئی مفصل فہرست بھی اتنی جامع نہیں ہو سکتی۔

۱۸ یعنی باہانِ رحمت کی خوشخبری دینے کے لیے۔

۱۹ یہ ایک اور قسم کی ہواؤں کا ذکر ہے جو بہا زانی میں مددگار ہوتی ہیں۔ قدیم زمانہ کی بادبانی کشتیوں اور بہا زوں کا سفر زیادہ تر بادِ موافق پر منحصر تھا اور بادِ مخالف ان کے لیے تباہی کا پیش خیمہ ہوتی

پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لیکر آئے، پھر جنہوں نے جرم کیا ان سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ سختی تھا کہ ہم مومنین کی مدد کریں۔

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے، یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر تھی اس لیے بارش لانے والی ہواؤں کے بعد ان ہواؤں کا ذکر ایک نعمتِ خاص کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔
یعنی تجارت کے لیے سفر کرو۔

یعنی ایک قسم کی نشانیاں تو وہ ہیں جو کائناتِ فطرت میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جن سے انسان کو اپنی زندگی میں ہر آن سابقہ پیش آتا ہے، جن میں سے ایک ہواؤں کی گردش کا یہ نظام ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے اور دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو انبیاء علیہم السلام معجزات کی صورت میں، کلامِ الہی کی صورت میں، اپنی غیر معمولی پاکیزہ سیرت کی شکل میں، اور انسانی معاشرے پر اپنی حیات بخش تاثیرات کی شکل میں لیکر آتے۔ یہ دونوں قسم کی نشانیاں ایک ہی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ جس توحید کی تعلیم انبیاء دے رہے ہیں وہی برحق ہے۔ ان میں سے ہر نشانہ دوسری کی توثیق ہے۔ کائنات کی نشانیاں انبیاء کے بیان کی صداقت پر شہادت دیتی ہیں اور انبیاء کی لائی ہوئی نشانیاں اس حقیقت کو کھولتی ہیں جس کی طرف کائنات کی نشانیاں اشارے کر رہی ہیں۔

یعنی جو لوگ ان دونوں نشانیوں کی طرف سے اندھے بن کر توحید سے انکار پر مجھے رہے اور خدا سے بغاوت ہی کیے چلے گئے۔

ہے۔ اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھی دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھینتی کو زرد پائیں تو وہ کفر کرتے رہ جاتے ہیں۔ (اُسے نبی، تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے، نہ ان پہروں کو سنا سکتے ہو جو

۳۷۔ یہاں جس انداز سے نبوت اور بارش کا ذکر کیے بعد دیگرے کیا گیا ہے اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ نبی کی آمد بھی انسان کی اخلاقی زندگی کے لیے ویسی ہی رحمت ہے جیسی بارش کی آمد اس کی مادی زندگی کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہے۔ جس طرح آسمانی بارش کے نزول سے مردہ پُری ہوئی زمین یکا یک جی اٹھتی ہے اور اس میں کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، اسی طرح آسمانی وحی کا نزول اخلاق و روحانیت کی ویران پُری ہوئی دنیا کو جلا اٹھاتا ہے اور اس میں فضائل و محامد کے گلزار لہلہانے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ کفار کی اپنی بد قسمتی ہے کہ خدا کی طرف سے یہ نعمت جب اُن کے پاؤں آتی ہے تو وہ اس کا کفران کرتے ہیں اور اس کو اپنے لیے مُردہ رحمت سمجھنے کے بجائے پیام موت سمجھ لیتے ہیں۔

۳۸۔ یعنی بارانِ رحمت کے بعد جب کھیتیاں سرسبز ہو چکی ہوں اس وقت اگر کوئی ایسی سخت سردی یا سخت گرم ہوا چلی پڑے جو ہری بھری فصلوں کو جلا کر رکھ دے۔

۳۹۔ یعنی پھر وہ خدا کو کہنے لگتے ہیں اور اس پر الزام رکھنے لگتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی مصیبتیں ہم پر ڈال رکھی ہیں۔ حالانکہ جب خدا نے ان پر نعمت کی بارش کی تھی اس وقت انہوں نے شکر کے بجائے اس کی ناقدری کی تھی۔ یہاں پھر ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ جب خدا کے رسول اُس کی طرف سے پیامِ رحمت لاتے ہیں تو لوگ ان کی بات نہیں مانتے اور اس نعمت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے کفر کی پاداش میں خدا ان پر ظالموں اور جباروں کو مسلط کر دیتا ہے اور وہ جو رستم کی چکی میں انہیں پیستے ہیں اور جو ہر آدمیت کا قلع قمع کر ڈالتے ہیں تو وہی لوگ خدا کو گالیوں دینا شروع کر دیتے ہیں اور اسے الزام دیتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی ظلم سے بھری ہوئی دنیا بنا ڈالی ہے۔

۴۰۔ یہاں مُردوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ضمیر مر چکے ہیں، جن کے اندر اخلاقی زندگی کی رتق بھی باقی نہیں رہی ہے، جن کی بندگی نفس اور خدا اور ہٹ دھرمی نے اُس صلاحیت ہی کا خاتمہ کر دیا ہے۔

پہلے پھیرے پلے جا رہے ہوں، اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہِ راست دکھا سکتے ہو۔ تم تو صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور تمہیں تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی، پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی، پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اور جب وہ ساعت برپا ہوگی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے

جو آدمی کو حق بات سمجھنے اور قبول کرنے کے قابل بناتی ہے۔

۱۷۷ بہروں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دلوں پر ایسے قفل چڑھا رکھے ہیں کہ سب کچھ سن کر بھی وہ کچھ نہیں سنتے۔ پھر جب ایسے لوگ یہ کوشش بھی کریں کہ دعوتِ حق کی آواز سرے سے ان کے کان میں پڑنے ہی نہ پاتے، اور داعی کی شکل دیکھتے ہی دُور بھاگنا شروع کر دیں تو ظاہر ہے کہ کوئی انہیں کیا سنائے۔ اور کیسے سنائے۔

۱۷۸ یعنی نبی کا کام یہ تو نہیں ہے کہ اندھوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ساری عمر راہِ راست پر چلا تا رہے۔ وہ تو راہِ راست کی طرف رہنمائی ہی کر سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کی پیٹھ کی آنکھیں پھوٹ چکی ہوں اور جنہیں وہ راستہ نظر ہی نہ آتا ہو جو نبی انہیں دکھانے کی کوشش کرتا ہے، ان کی رہنمائی کرنا نبی کے بس کا کام نہیں ہے۔

۱۷۹ یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا، یہ ساری حالتیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ اسی کی مشیت پر موقوف ہے کہ جسے چاہے کمزور پیدا کرے اور جس کو چاہے طاقت ور بنا دے، جسے چاہے بچپن سے جوانی تک نہ پہنچنے دے اور جس کو چاہے جوانا مرگ کر دے، جسے چاہے لمبی عمر دے کہ بھی تندرست و توانا رکھے اور جس کو چاہے شاندار جوانی کے بعد بڑھاپے میں اس طرح اٹیریاں رگڑوائے کہ دنیا اسے دیکھ کر عبرت کرنے لگے۔ انسان اپنی جگہ جس گھنڈ میں چاہے مبتلا ہوتا رہے مگر خدا کے قبضہ قدرت میں وہ اس طرح بے بس ہے کہ جو حالت بھی خدا اس پر طاری کر دے اسے وہ اپنی کسی تدبیر سے نہیں بدل سکتا۔

میں، اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے۔ مگر جو علم اور ایمان سے پہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روزِ حشر تک پڑے رہے ہو، سو یہ وہی روزِ حشر ہے، لیکن تم جانتے نہ تھے۔ پس وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا۔

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سبھایا ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ، جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ اس طرح ٹھپہ لگا دیتا ہے اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو جاہل ہیں۔ پس (اے نبی) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

۱۱۔ یعنی قیامت جس کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے۔

۱۲۔ یعنی مرنے کے وقت سے قیامت کی اس گھڑی تک۔ ان دونوں ساعتوں کے درمیان چالیس دس بیس ہزار برس ہی گزر چکے ہوں، مگر وہ یہ محسوس کریں گے کہ چند گھنٹے پہلے ہم سوئے تھے اور اب اچانک ایک حادثہ نے ہمیں جگا اٹھایا ہے۔

۱۳۔ یعنی ایسے ہی غلط انداز سے یہ لوگ دنیا میں بھی لگاتے تھے۔ وہاں بھی یہ حقیقت کے ادراک سے محروم تھے، اسی وجہ سے یہ حکم لگایا کرتے تھے کہ کوئی قیامت و قیامت نہیں آئی، مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، اور کسی خدا کے سامنے حاضر ہو کر ہمیں حساب نہیں دینا۔

۱۴۔ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے "نہ ان سے یہ چاہا جائے گا کہ اپنے رب کو راضی کر دے، اس لیے کہ توبہ اور ایمان اور عملِ صالح کی طرف رجوع کرنے کے سارے مواقع کو وہ کھو چکے ہوں گے اور امتحان کا وقت ختم ہو کر فیصلے کی گھڑی آچکی ہوگی۔"

۱۵۔ اشارہ ہے اُس وعدے کی طرف جو اوپر آیت نمبر ۱۴ میں گزر چکا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اللہ کے اصولوں کی لائی ہوئی پیمانہ کا رابلہ ٹکڑی سے تضحیک اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کیا ہے اللہ نے ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیا ہے۔ **وَإِنَّا نَقَمْنَا** **مَنْ الذِّمِّيْنَ أَجْرًا مَوَا)،** اور اللہ پر یہ حق ہے کہ مومنوں کی نصرت فرمائے **وَوَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ**

اور ہرگز ہلکانہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔

۵۵ یعنی دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور و غوغا سے تم دب جاؤ، یا ان کی بہتان و
 افترا کی مہم سے تم مرعوب ہو جاؤ، یا ان کی پھبتیوں اور طعنوں اور تضحیک و استہزاد سے تم ہمت
 ہو جاؤ، یا ان کی دھمکیوں اور طلاق کے مظاہروں اور شتم و ستم سے تم ڈر جاؤ، یا ان کے ویسے چٹے
 لالچوں سے تم پھسل جاؤ، یا توہمی معاہدے کے نام پر جو ایلیں وہ تم سے کر رہے ہیں ان کی بنا پر تم ان کے
 ساتھ مصالحت کر لینے پر اتر آؤ۔ اس کے بجائے وہ تم کو اپنے مقصد کے شعور میں اتنا شوخ مند اور
 اپنے یقین و ایمان میں اتنا پختہ، اور اپنے عزم میں اتنا راسخ اور اپنے کیر کڑ میں اتنا مضبوط پائیں کہ نہ
 کسی خوف سے تمہیں ڈرایا جاسکے، نہ کسی قیمت پر تمہیں خریدا جاسکے، نہ کسی ذریعہ سے تم کو پھسلایا جا
 سکے، نہ کوئی خطرہ یا نقصان یا تکلیف تمہیں اپنی راہ سے ہٹا سکے، اور نہ دین کے معاملہ میں کسی بین
 دین کا سودا تم سے چکایا جاسکے۔ یہ سارا مضمون اللہ تعالیٰ کے کلام بلاغت نظام نے اس ذرا سے
 فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ یہ بے یقین لوگ تم کو ہلکانہ پائیں۔ اب اس بات کا ثبوت تاریخ کی
 بے لاگ شہادت دیتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا پر ویسے ہی بھاری ثابت ہوئے جیسا اللہ اپنے
 آخری نبی کو بھاری بھر کم دیکھنا چاہتا تھا۔ آپ سے جس نے جس میدان میں بھی زور آزمائی کی اس نے
 اسی میدان میں مات کھائی اور آخر اس شخصیت عظمیٰ نے وہ انقلاب برپا ہی کر کے دکھا دیا جسے
 روکنے کے لیے عرب کے کفر و شرک نے اپنی ساری طاقت صرف کر لی اور اپنے سارے حربے
 استعمال کر ڈالے۔